# ارض القرآن کا سفر

(از محمد عاصم)

(۴)

**ریاض** یہ وادی حنیفہ کے قریب سعودی حکومت کا پایۂ تخت ہے۔ یہ نجد کے جس علاقہ میں واقع ہے اسے عارض کہا جاتا ہے، جو قبیلہ بنو تمیم کا قدیم مسکن رہا ہے۔ ۱۸۱۸ء سے پہلے ریاض عارض کے دوسرے قصبوں کی طرح ایک معمولی قصبہ تھا، لیکن ۱۸۱۸ء میں درعیہ کی تباہی کے بعد جب آلِ سعود نے اسے اپنا پایۂ تخت بنا لیا، تو اسے پورے نجد میں خاص اہمیت حاصل ہو گئی۔ اس وقت سے آج تک یہی آل سعود کا پایۂ تخت چلا آ رہا ہے، اگرچہ ۱۸۹۶ء میں حائل کے امراء آل الرشید نے اس پر قبضہ کر کے وقتی طور پر آل سعود کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا، لیکن اس کے چند ہی سال بعد ۱۹۰۲ء میں موجودہ فرمانروا شاہ سعود کے والد عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن نے اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کی مدد سے اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا۔ یہ شہر شروع سے اپنی سرسبزی اور باغات کی وجہ سے مشہور رہا ہے اور اسی وجہ سے اس کا نام ریاض (جمع روضہ) ہے۔

۱۸ اور ۱۹ نومبر کی درمیانی شب ہم ریاض پہنچ گئے۔ رات کے بارہ بج چکے تھے، ہم نے سوچا کہ ہم یہاں بالکل اجنبی ہیں اور کسی مناسب ہوٹل کا ہمیں علم نہیں ہے اس لیے پہلے دار الضیافہ جا کر دیکھیں، اگر وہاں کوئی ذمہ دار آدمی مل گیا تو خیر، ورنہ قریب میں جو ہوٹل بھی مل جائے اسی میں قیام کر لیا جائے۔ چنانچہ مولانا سٹیشن پر ٹھہرے رہے اور میں اور چودھری صاحب ٹیکسی لے کر دار الضیافہ روانہ ہوئے۔ راستے میں ریاض کی بہت سی سڑکوں اور بازاروں سے ہمارا گزر ہوا، جو نہایت شاندار اور جدید طرز پر بنے ہوئے تھے اور ان پر بجلی کی روشنی کا عمدہ انتظام تھا۔ دکانیں اگرچہ بند تھیں، لیکن اندازہ ہوا کہ گزشتہ چند سال کے اندر ریاض بہت ہی وسیع اور جدید

طرز کا شہر بن چکا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں جب مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے ساتھ میں پہلی مرتبہ ریاض آیا تھا تو یہ ایک معمولی قسم کا قصبہ تھا، ہمارے ہاں کے دیہات سے بھی گیا گذرا۔ نہ یہاں کوئی بازار تھا اور نہ کوئی پختہ سڑک (سوائے ایک سڑک کے جو شہر سے ہوائی اڈہ تک جاتی تھی) بجلی تھی لیکن بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد تک محدود۔ تنگ و تاریک قسم کی گلیوں میں معمولی قسم کی دکانیں تھیں اور ان ہی کو بازار کہا جاتا تھا۔ نہ یہاں کوئی ہوٹل اور نہ کرائے کی کوئی سواری مل سکتی تھی۔ تمام مکانات حتیٰ کہ بادشاہ اور امراء کے محلات بھی کچے تھے۔ البتہ نئی تعمیرات کا آغاز ہو چکا تھا جس کی ابتدا شاہی خاندان کے محلات کی تعمیر سے ہو رہی تھی لیکن اب تو سارا نقشہ ہی بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ دارالضیافہ بھی اگرچہ (جیسا کہ میرا خیال ہے) وہی تھا جس میں میں اور مولانا مسعود عالم صاحب ٹھہرے تھے، لیکن بالکل بدلا ہوا۔ پہلے بالکل کچا تھا، اور اب پختہ اور نہایت شاندار۔ ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک ملازم باہر آیا۔ اس نے بتایا کہ مدیر الضیافہ شیخ ابن جمیح اس وقت موجود نہیں ہیں، آپ لوگ یا تو صبح آئیں یا اسی وقت ان کے مکان پر ان سے ملاقات کر لیں۔ رات کے وقت ہم نے ان کے ہاں جانا مناسب نہ سمجھا اور ٹیکسی والے سے کہا کہ کسی قریب کے ہوٹل میں ہمیں لے جائے۔ وہ ہمیں شارع البطحاء پر ایک ہوٹل "فندق السلام" میں لے گیا۔ معمولی قسم کا ہوٹل تھا، لیکن کرایہ بہت زیادہ، یعنی دس ریال (۱۳ روپے) فی کس یومیہ۔ اس وقت ہم نے اسی کو غنیمت جانا اور وہیں اپنا سامان اتار لیا۔ بعد میں چودھری صاحب مولانا کو بھی یہیں لے آئے۔

**ریاض کی شان و شوکت** صبح ناشتہ کے بعد فکر ہوئی کہ یہاں ریاض میں جن لوگوں سے ہمیں ملنا ہے، ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ کیونکر شروع کیا جائے؟ استاد عبدالحکیم عابدین کے متعلق معلوم تھا کہ وہ ایک ہوٹل "زہرۃ الشرق" میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ خبر کی ملاقات کے دوران انہوں نے ہمیں اپنے کمرے کا نمبر بھی دے دیا تھا۔ سوچا کہ پہلے ان سے ملا جائے اور پھر کوئی پروگرام طے کیا جائے۔ مولانا ہوٹل میں رہے۔ میں اور چودھری صاحب ایک

ٹیکسی لے کر "زہرۃ الشرق" گئے، جو ریاض کا سب سے شاندار ہوٹل ہے اور اس کی سب سے شاندار سڑک "شارع المطار" (ہوائی اڈہ کی سڑک) پر واقع ہے۔ اس کے تمام کمرے گرمی اور سردی دونوں میں ایرکنڈیشنڈ ہیں اور اس میں ایک دن کے قیام کا کرایہ ۶۰ ریال (۸۰ روپے) فی کس ہے۔ شان و شوکت اور خوبصورتی کے لحاظ سے اس کے پائے کا ہوٹل کم از کم میرے اندازے کے مطابق نہ پاکستان میں ہے اور نہ مصر، شام اور عراق میں۔ شارع المطار کی خوبصورتی اور شان و شوکت کے بھی کیا کہنے۔ ہمارے ہاں کراچی، لاہور کی کوئی سڑک بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کے دونوں کناروں پر زراعت، مالیات، تعلیم، مواصلات اور دوسری وزارتوں کے جدا جدا شاندار دفاتر واقع ہیں جن میں سے ہر ایک کی تعمیر پر لاکھوں روپیہ صرف آیا ہے۔ یہ سب جدید ترین مغربی طرز پر بنے ہوئے ہیں اور ہر ایک کا طرز تعمیر نرالا ہے۔ گزشتہ چند سال کے اندر سعودی حکومت کی تمام وزارتوں کے دفاتر ریاض منتقل ہو گئے ہیں۔ صرف وزارتِ خارجہ اور وزارتِ داخلہ ابھی تک علی الترتیب جدہ اور مکہ معظمہ میں ہیں اور شاید آئندہ کئی سال تک وہیں رہیں۔

استاذ عبدالحکیم عابدین کے متعلق دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک دوسرے ہوٹل "فندق الیمامہ" میں منتقل ہو گئے ہیں۔ یہ ہوٹل بھی شارع المطار ہی پر واقع ہے اور اپنی شان و شوکت اور انتظامات میں "زہرۃ الشرق" سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ وہاں استاذ موصوف ہمیں مل گئے۔ انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ ہم ایک معمولی ہوٹل میں ٹھیر گئے ہیں تو انہوں نے چاہا کہ ہمیں شاہی مہمان بنوانے کی کوشش کریں۔ لیکن خواہ مخواہ کوشش کر کے مہمان بننا ہمیں پسند نہ تھا۔ استاذ عابدین کو ساتھ لیکر ہم مولانا کے پاس "فندق السلام" آتے اور وہاں یہی طے ہوا کہ جتنے دن بھی ریاض میں ٹھہرنا ہو ہم اسی ہوٹل میں ٹھہرے رہیں گے۔ معلوم ہوا کہ ریاض میں یا تو اسی طرح کے چند معمولی ہوٹل ہیں یا پھر "زہرۃ الشرق" اور "الیمامہ" جیسے دو شاندار ہوٹل جن میں ٹھہرنا بہرحال ہماری بساط سے باہر تھا۔ استاذ عبدالحکیم عابدین بار بار شرمندگی محسوس کرتے رہے اور اپنے

فندق الیمامہ میں قیام پر معذرت کرتے رہے کہ اس ہوٹل میں میرا قیام اپنے مصارف پر نہیں ہے بلکہ میرا موکل جو اپنے مقدمہ کی پیروی کے لیے مجھے بیروت سے لایا ہے، خود بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہے اور مجھے بھی اپنے ساتھ وہیں ٹھہرالیا ہے۔

اسی روز عصر کے قریب ہمارے مکہ معظمہ کے دوست عبداللہ بن کلیب تشریف لائے جو ان دنوں اپنے ایک ذاتی کام کے سلسلے میں ریاض آئے ہوئے تھے۔ استاذ عبدالحکیم عابدین سے انہیں ہماری آمد کی اطلاع ہوئی تو فوراً ملاقات کے لیے آ گئے۔ ان کے ساتھ دو صاحب اور بھی تھے جن سے ہمارا تعارف پہلی مرتبہ ہوا۔ ایک شیخ مَنّاع القطّان جو ریاض کے کلیتہ الشریعہ میں پروفیسر ہیں اور اصل میں مصر کے رہنے والے ہیں، لیکن اخوان سے تعلق ہونے کی وجہ سے مصر سے نکال دیے گئے ہیں۔ دوسرے احمد باحشوان جو حضر موت کے باشندے ہیں اور ریاض کے ایک ابتدائی مدرسہ میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ شیخ مناع القطان نے ہمیں اگلے روز اپنے ہاں ناشتہ کی دعوت دی جو ہم نے منظور کر لی۔

<u>شیخ عبدالعزیز بن باز</u> مغرب کے بعد نجد کے مشہور عالم شیخ عبدالعزیز بن باز چند اصحاب کے ساتھ تشریف لائے۔ استاذ عابدین سے انہیں ہماری ریاض میں آمد کی اطلاع ہو گئی تھی۔ شیخ عبدالعزیز گو پیدائشی نابینا ہیں اور زیادہ عمر کے بھی نہیں ہیں، لیکن ان کا شمار سعودی عرب کے چند بڑے علماء میں ہوتا ہے۔ اپنے اخلاص، علم، ذہانت، سادگی، استغناء، طالب علمانہ مزاج اور سب سے بڑھ کر حق گوئی میں جرأت کی وجہ سے وہ پوری مملکت میں نہایت مشہور و محبوب ہیں۔ ان کے پاس کوئی سرکاری عہدہ نہیں ہے۔ صرف کلیتہ الشریعہ میں پڑھاتے ہیں اور وہیں سے مشاہرہ پاتے ہیں۔ ان کی حق گوئی کا ایک واقعہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ ۱۹۴۹ء میں جب میں اور مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم ریاض آئے تھے، تو ایک روز شام کے وقت ہم لوگ مفتی اکبر شیخ محمد بن ابراہیم کے مکان پر بیٹھے ہوئے تھے، آل الشیخ (شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خاندان کے علماء و مشائخ کے علاوہ شیخ عبدالعزیز بن باز بھی موجود تھے۔ ان دنوں پاکستان میں سعودی حکومت کے سفیر سید

عبدالحمید خطیب تھے۔ سب لوگ ان کی دینداری کی تعریف کر رہے تھے۔ شیخ عبدالعزیز بولے "سید عبدالحمید خطیب کی میں بھی عزت کرتا ہوں اور پاکستان میں ان کی سرگرمیوں کا حال سن کر بڑی خوشی ہوتی ہے مگر انہوں نے رمضان کے "امساکیہ" (نقشہ افطار و سحر) میں سلطان اور ولیعہد کی تصویر چھاپ کر بُرا کیا ہے۔ یہ چیز اچھی نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آگے چل کر ان کی پرستش شروع ہو جائے"۔ شیخ کی محبوبیت کا یہ حال ہے کہ ہم نے اپنے پورے سفر کے دوران سعودی مملکت کے اندر بھی اور اس سے باہر دوسرے عرب ملکوں میں بھی کوئی ایسا آدمی نہیں پایا جو ان کے علم، اخلاص اور حق گوئی کا قائل اور مداح نہ ہو۔ پاکستان کے سعودی سفیر نے ہمیں ان کے نام ایک دستی خط دیا تھا، اس لیے ہمارا خیال تھا کہ ان کے ہاں خود حاضر ہوں لیکن انہوں نے پیش قدمی فرمائی اور خود ہی ملاقات کے لیے تشریف لے آئے۔ دراصل عربوں کے ہاں مہمان کے استقبال اور تواضع کے جو اصول ہیں، ان میں "القادم یزار" (یعنی یہ کہ پہلے مہمان سے اس کی جائے قیام پر ملاقات کی جائے اور پھر اسے اپنے ہاں بلایا جائے) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ شیخ عبدالعزیز بن باز کو اس سے پہلے مولانا اور ان کے کارناموں۔ ان لوگوں کے بقول "جہاد" ــــ سے واقف تھے اور ان کی چند کتابیں بھی پڑھ چکے تھے لیکن دونوں کے درمیان کبھی ملاقات یا مراسلت کا سلسلہ نہ رہا تھا۔ سلام و دعا کے بعد بار بار مولانا سے خیریت دریافت فرماتے رہے۔

اہلِ نجد کی عادت ہے کہ وہ اپنے مہمان اور ملنے والے سے بار بار "کیف حالکم؟" کہتے ہیں اور "عساکم طیبین، عساکم بخیر" کے اس قدر پے در پے سوالات کرتے ہیں کہ ایک غیر عرب مہمان حیران رہ جاتا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ بات بات پر وہ اپنے مخاطب کو دعائیں دیتے ہیں۔ ریاض میں "طال عمرک" (آپ کی عمر دراز ہو) تو ہر شخص کا تکیہ کلام ہے۔ ہر دعا کا ایک مخصوص جواب یہ لوگ آپس میں تو بڑی آسانی سے دے لیتے ہیں لیکن مشکل ہم جیسے اجنبی لوگوں کو پیش آتی ہے۔ جواب نہ دیں تو یہ بڑی بدتہذیبی ہے اور جواب دیں تو ہر مرتبہ پہلے سے مختلف کیا جواب دیں؟

لہ یہاں ضمناً یہ بات بیان کر دینا شاید نامناسب نہ ہو کہ دوسرے عرب ممالک کے علماء تو اب تصویر کو حلال (دیکھئے صفحہ ۵۵ پر)

ہم نے شیخ کو سعودی سفیر کا خط دیا اور انہوں نے وہیں اسے اپنے ایک شاگرد سے پڑھوا کر سنا۔ اس کے بعد سفر کی غرض و غایت اور پروگرام کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ آخر میں شیخ نے مولانا سے دریافت فرمایا "کیا آپ (شاہ کے چچا) امیر عبداللہ بن عبدالرحمٰن کے ہاں جانا پسند کریں گے؟" امیر عبداللہ بن عبدالرحمٰن کے متعلق شیخ نے بتایا کہ اس وقت یہ آل سعود (شاہی خاندان) کے سب سے بڑے بزرگ اور اقرب الی الدین آدمی ہیں۔ مولانا تیار ہو گئے اور اس کے بعد ہم سب شیخ ہی کی موٹر میں بیٹھ کر امیر عبداللہ کے قصر پہنچے۔ لیکن معلوم ہوا کہ امیر موجود نہیں ہیں۔ اس کے بعد ہم ان کے چھوٹے بھائی امیر مساعد بن عبدالرحمٰن (جو ان دنوں امیر فیصل کی عدم موجودگی میں قائمقام وزیر اعظم تھے) سے ملنے کے لیے روانہ ہوئے۔

**قدیم ریاض** راستے میں اندازہ ہوا کہ اگرچہ ریاض بہت کچھ تبدیل ہو گیا ہے اور اس میں بڑی شاندار سڑکیں اور عمارتیں بن چکی ہیں، لیکن ابھی قدیم ریاض بھی اپنی کچی گلیوں اور عمارتوں کے ساتھ باقی ہے۔ لوگوں نے ہمیں بتایا کہ جو مکانات کچے ہیں، انہیں قصداً کچا رکھا گیا تھا کیونکہ یہاں کی آب و ہوا میں کچے مکانات ہی زیادہ مناسب ہیں۔ پختہ مکانات جب تک ایر کنڈیشنڈ نہ ہوں، ان میں گرمی اور سردی دونوں میں سخت تکلیف ہوتی ہے لیکن اب پرانے مکانات کو گرانے اور ان کی جگہ نئے پختہ مکانات بنانے کا سلسلہ جاری ہے اور امید ہے کہ آئندہ دس سال میں سارا شہر پختہ اور نئے طرز پر تعمیر ہو جائے گا۔ امیر مساعد کا مکان بھی قدیم ریاض کی ایک گلی میں واقع ہے اور اس پر کوئی جھنڈا یا علامتی نشان بھی نہیں ہے اور نہ ڈیوڑھی پر پولیس کا پہرہ ہے (دو چار سپاہی اندر کہیں

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵۷) سمجھتے ہیں۔ لیکن نجد کے علماء اس کی حرمت پر متفق ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس وقت سعودی عرب میں بھی علماء کی مرضی کے علی الرغم تصاویر کو رواج عام حاصل ہو گیا ہے اور دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ تاہم علماء کی رائے کا یہ اثر ضرور ہے کہ ہمیں ریاض کے کسی رئیس یا سرکاری افسر کے مکان میں اور کسی ہوٹل یا دوکان میں کوئی تصویر علانیہ دیواروں پر لٹکی ہوئی نظر نہیں آئی۔ بازاروں میں کوئی اشتہاری بورڈ بھی تصویر کے ساتھ نہیں دیکھا۔

ہوں تو اور بات ہے)۔ اس لیے شیخ کا ڈرائیور ان کا مکان نہ پہچان سکا اور ہم ایک دوسری گلی میں ایک دوسرے امیر کے ہاں پہنچ گئے۔ ہمیں تو خیر کچھ پتہ ہی نہ تھا، لیکن شیخ عبدالعزیز اور استاذ عبدالحکیم عابدین کو وہاں پہنچتے ہی اندازہ ہو گیا کہ ہم غلط جگہ آ گئے ہیں۔ کچھ دیر وہاں بیٹھے، قہوہ اور چائے بھی پی، تاکہ ان پر یہ ظاہر نہ ہو کہ ہم غلطی سے ان کے ہاں آ گئے ہیں۔ وہاں سے نکلنے کے بعد استاذ عبدالحکیم عابدین نے ہمیں حقیقت حال سے مطلع کیا۔ اس کے بعد ہم امیر مساعد کے ہاں پہنچے، مگر وہ بھی موجود نہ تھے۔ پھر شیخ عبدالعزیز ہمیں اپنے مکان پر لے آتے، جو قدیم ریاض جی کی ایک گلی میں واقع ہے۔ وہاں ان کے شاگردوں اور عقیدتمندوں کا حلقہ لگا ہوا تھا۔ مجلس نہایت سادہ اور زمین پر قالین کے فرش کی تھی۔ تمام حاضرین نے رسمی سلام و مصافحہ کے بعد اپنا اپنا تعارف کرایا۔ اور اپنے پاکستانی "سلفی بھائیوں" کا حال دریافت کرنے لگے۔ نجدی علماء اور ان کے متعلقین جب بھی کسی پاکستانی یا ہندوستانی مسلمان سے ملتے ہیں یہاں کے اہل حدیث حضرات کے متعلق ضرور سوال کرتے ہیں۔ ہم نے مجمل الفاظ میں انہیں پاکستان کے اہلحدیث حضرات کی خیریت کی اطلاع دی۔ اس کے بعد مولانا نے شیخ کی خدمت میں اپنی چار عربی کتابیں ورسالہ دینیات، اسلام کا نظام حیات، مسلمانوں کا ماضی و حال اور قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں پیش کیں۔

**نجدی ضیافت** | یہ بتانا شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ اس اثنا میں شیخ نے بخور (لوبان کا دھواں) قہوہ اور چائے سے ہماری تواضع فرمائی تھی۔ اس سے پہلے ہم عربی تہذیب کے ان لوازم کی ترتیب، اہمیت اور آداب کو اچھی طرح نہیں جانتے تھے۔ آج کی خالص نجدی مجلس میں ان کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہوا۔ سب سے پہلے شیخ کا ایک ملازم مجمر (انگارا دان جو لکڑی کا بنا ہوتا ہے اور اس کے اوپر سرخ روغن کر کے باریک باریک سنہری کیلیں لگی ہوتی ہیں اور اوپر کے حصے میں کوئلے رکھنے کی جگہ ہوتی ہے) لے کر شیخ کے پاس آیا۔ شیخ نے اپنی جیب سے لوبان کا ایک ٹکڑا نکال کر کوئلوں پر رکھا، جس سے دھواں اٹھنے لگا۔ پھر اس ملازم نے مجمر لے کر تمام شرکائے مجلس کے سامنے دو تین مرتبہ چکر لگایا۔ اپنے ہاتھوں سے چہروں اور کپڑوں پر دھواں لے رہے تھے۔ بعض لوگ تو مجمر اپنے ہاتھ

میں لے کر ایک دو منٹ تک اپنے رومال یا مشلہ (عربی چغہ) کے اندر رکھتے اور پھر اسے لوٹا دیتے۔ ہمارے لیے یہ منظر بڑا ہی دلچسپ تھا۔ دوسروں کو دیکھ کر ہم بھی مجمر کے دھوئیں سے متمتع ہوئے۔ بخور کا یہ رواج عربوں کے ہاں بہت پرانا ہے اور اسے مہمان کی خاطر مدارات کا اہم ترین جزو شمار کیا جاتا ہے۔ کتاب الاغانی اور ادب کی دوسری کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عباسی خلفاء کے دربار میں بھی بخور کا اسی طرح دور چلا کرتا تھا۔

پھر قہوہ کا دور شروع ہوا، اور اس کی شکل یہ تھی کہ وہی ملازم اپنے ایک ہاتھ میں قہوہ کا ایک لمبا سا برتن اور دوسرے ہاتھ میں فنجان کی دو آتوں جیسی چھوٹی چھوٹی چند پیالیاں لے کر نمودار ہوا۔ وہ باری باری ہر شخص کو ایک ایک پیالی دیتا اور اس میں قہوہ کے چند قطرے ڈال دیتا۔ ہر شخص قہوہ کے یہ چند قطرے پی کر پیالی ملازم کے حوالے کر دیتا۔ اس طرح جب پورا چکر ختم ہو جاتا، تو دوسرا چکر شروع ہوتا، اور جب تک کوئی شخص ایک خاص طریقہ سے اپنی پیالی ہلا کر واپس نہ کرتا اس کی پیالی میں بار بار قہوہ ڈالنے کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس کے بعد چائے (بلا دودھ) آئی اور پھر قہوہ کا ایک اور دور چلا۔ یہ کم سے کم ضیافت ہے جو ہر نجدی اپنے مہمان کے لیے لازماً کرتا ہے۔ نجدی حضرات کا یہ قہوہ الائچی اور بُن (مکئی کے دانے کے برابر ایک سخت چیز جو یمن یا حبشہ سے برآمد کی جاتی ہے) کو بھون کر تیار کیا جاتا ہے اور اس قدر تلخ ہوتا ہے کہ واقعی اسے ہر مرتبہ چند قطروں سے زیادہ نہیں پیا جا سکتا۔ معلوم نہیں عربوں کے ہاں قہوہ کا یہ رواج کب سے ہوا، لیکن اب تو یہ لوگ اسے بڑے ہی مزے سے پیتے ہیں اور بعض تو اس کے اس قدر دلدادہ ہوتے ہیں کہ جب تک صبح اٹھ کر اس کی خدمت نہ کر لیں اور اس کے چند گھونٹ حلق سے نیچے نہ اتار لیں، اپنے اندر چستی محسوس نہیں کرتے۔ ایک مرتبہ ایک عرب کو علی الصباح قہوہ بنا کر پیتے دیکھ کر مولانا فرمانے لگے کہ ہمارے ہاں حقہ پینے اور پان کھانے والوں کو "شرم" آنی چاہیے کہ انہیں اپنے حقے اور پان سے اتنا بھی عشق نہیں ہے جتنا ان لوگوں کو اپنے قہوہ سے ہے

؎ اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

**شاہ سعود کا قصر الناصریہ** عشا کی نماز شیخ عبدالعزیز بن باز کے ہاں ادا کر کے ہم اپنے ہوٹل کی طرف واپس ہوئے۔ راستے میں شیخ کے ڈرائیور نے ہمیں ریاض دکھایا۔ پہلے اس نے ہمیں شارع المطار اور شارع الجامعہ (یونیورسٹی کی سڑک) کی سیر کرائی، جو بجلی کی روشنی میں بہت ہی شاندار اور خوبصورت نظر آرہی تھیں۔ معلوم ہوا ہے کہ گذشتہ چار سال میں سعودی حکومت نے ریاض کی سڑکوں پر جو رقم صرف کی ہے وہ تقریباً ۶۵۳،۳۷۱۶۸ روپے ہے۔ پھر وہ ہمیں شاہ سعود کے محل "الناصریہ" لے گیا، جس کی خوبصورتی اور شان و شوکت کو بیان کرنا کم از کم میرے جیسے کوتاہ قلم اور غیر ادیب آدمی کے لیے بڑا ہی مشکل ہے۔ کم از کم ایک میل لمبا اور نصف میل چوڑا باغ ہے اور اس کے وسط میں نہایت ہی شاندار محل۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس باغ کے اندر جانے اور محل کے ارد گرد گھومنے اور سیر کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ جو شخص چاہے اس کی سیر کر سکتا ہے۔ اس پر ہمیں اپنے ہاں کے حکامِ عالی مقام بڑے یاد آئے۔

اگلے دن (۲۰ نومبر) کو علی الصباح ریاض کے کلیۃ الشریعہ کے تین شامی طلبہ ہماری ملاقات کے لیے ہوٹل آئے۔ انہوں نے مولانا کی تمام عربی کتابیں پڑھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہاں کلیۃ الشریعہ میں ایسے طلبہ کی تعداد جنہوں نے مولانا کی تمام عربی کتابیں پڑھی ہوئی ہیں، بیس سے زائد ہے اور وہ نہ صرف یہ کہ خود یہ کتابیں پڑھتے ہیں بلکہ دمشق سے انہیں منگوا کر دوسرے طلبہ میں بھی پھیلاتے اور فروخت کرتے ہیں۔ یہ تینوں طلبہ دراصل ہمیں اپنے ایک اجتماع میں دعوت دینے کے لیے آئے تھے، جسے یہ لوگ اسی روز عصر کے بعد خاص طور پر مولانا سے ملاقات کے لیے اپنے کالج میں منعقد کر رہے تھے اور اس میں صرف وہی طلبہ شریک ہو رہے تھے جو پہلے سے مولانا سے متعارف اور ان کی کتابیں پڑھے ہوئے تھے۔

**باپردہ عورتوں کا بازار** ۹ بجے (صبح) ہم اپنے وعدے کے مطابق شیخ مناع القطان کے ہاں گئے۔ ان کا مکان سبزی منڈی کے پاس ہے۔ وہاں منڈی میں ہم نے دیکھا کہ عورتوں کا ایک بازار الگ لگا ہوا ہے، جس میں صرف عورتیں کپڑے، برتن، مرغیاں، انڈے اور دوسری

چیزیں فروخت کر رہی تھیں اور عورتیں ہی خریدار تھیں۔ ان میں کوئی ایک عورت بھی ہمیں بے پردہ اور بے نقاب نظر نہ آئی۔ نقاب کے باوجود یہ سب بآسانی خرید و فروخت کر رہی تھیں۔ یہی منظر ۱۹۴۹ء میں ہم نے کویت میں بھی دیکھا تھا۔ اسے دیکھ کر ہمیں ان لوگوں کی عقل پر حیرت ہوئی، جو کہتے ہیں کہ عورت پردہ کے ساتھ کوئی کام نہیں کر سکتی۔

**عرب قومیت کا ثمرہ** | ناشتہ کے بعد دیر تک شیخ مناع القطان سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ وہ خاص طور پر عرب ممالک میں عرب قومیت کی تحریک سے سخت خطرے کا اظہار کرتے رہے۔ انہوں نے ایک مشہور عرب شاعر "القروی" کا قصیدہ ہمیں سنایا جس میں وہ کہتا ہے:

بلادك قدمها على كل ملة ومن اجلها افطر ومن اجلها صم

سلام على كفر يوحد بيننا واهلا وسهلا بعده بجهنم

قد مزقت هذه المذاهب بيننا وقد حطمتنا بين ناب ومنسم

[اپنے وطن کو ہر دین و ملت پر مقدم رکھو۔ اسی کے لیے افطار کرو اور اسی کے لیے روزہ رکھو۔ سلام ہو اس کفر پر جو ہمارے درمیان اتحاد پیدا کر دے۔ اس کے بعد اگر جہنم بھی نصیب ہو تو ہم اس کا خیر مقدم کریں گے۔ ان مذاہب نے تو ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور اونٹ کے دانتوں اور کھروں کے درمیان ہمیں پیس ڈالا ہے۔]

یہ اشعار سنا کر انہوں نے کہا کہ عرب قومیت کی یہ تحریک ایک سیدھی سادی بے ضرر قسم کی قومی تحریک نہیں ہے بلکہ درپردہ یہ مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کرنے اور الحاد و دہریت کی طرف دھکیل دینے کی تحریک ہے، جس کی سربراہی زیادہ تر یا تو لبنان کے عیسائی کر رہے ہیں یا مسلمانوں میں سے وہ فرنگیت زدہ لوگ جو دین کو اپنے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تصور کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس قصیدے پر مصر کی موجودہ حکومت نے قروی کو نیشان القداسہ (MEDAL OF HOLINESS) عطا فرمایا ہے اور عرب قوم پرستوں کے حلقے میں

وہ "قدیس القومیۃ العربیہ" کے خطاب سے نوازا جاتا ہے یعنی عرب قومیت کا مہا پروہت

(HIGH PRIEST)

اس روز جمعہ تھا۔ نماز کے وقت سے کچھ پہلے استاذ عبدالحکیم عابدین اپنے ایک دوست شیخ عبداللہ المشعری کے ساتھ تشریف لائے جو سعودی حکومت کی وزارت قانون کے سکرٹری ہیں۔ ان کے ساتھ ہم یونیورسٹی کے قریب ایک مسجد میں جمعہ پڑھنے کے لیے گئے۔ ایک نوجوان خطیب خطبہ دے رہا تھا۔ خطبہ کیا دے رہا تھا، اس نے پہلے سے ایک خطبہ کاغذ پر لکھ رکھا تھا یا کہیں سے نقل کر لیا تھا اور اسی کو پڑھ رہا تھا۔ سنا ہے کہ ریاض میں بڑے بڑے علماء تک کا یہی حال ہے۔ حتیٰ کہ مفتی اکبر شیخ محمد بن ابراہیم بھی "مجموعۃ خطب ایام الجمعۃ" نامی کتاب سے ایک خطبہ زبانی یاد کر کے سنا دیتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بڑے بڑے دینی مناصب آل الشیخ (شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خاندان) کے لیے مخصوص ہیں اور دوسرے لوگ صرف اسی صورت میں کسی بڑے دینی منصب پر مقرر کیے جاتے ہیں جبکہ آل الشیخ میں کوئی آدمی موجود نہ ہو۔ حرم مکی کے خطیب اگرچہ شیخ عبدالمہیمن (مصری) ہیں، لیکن وہ حرم کے خطیب اوّل نہیں ہیں، بلکہ خطیب اوّل آل الشیخ کے ایک فرزند شیخ عبدالعزیز بن حسن ہیں، جو وزارت تعلیم کے سکرٹری ہیں اور سارا سال ریاض میں رہتے ہیں۔ البتہ کبھی کبھار مکہ معظمہ جا کر حرم میں خطبہ دے آتے ہیں۔

**کلیۃ الشریعہ کے طلبہ کا اجتماع** عصر کے بعد ہم اپنے پروگرام کے مطابق کلیۃ الشریعہ کے طلبہ کے اجتماع میں گئے۔ کوئی پچیس کے قریب طلبہ تھے، جن میں سے اکثر شامی تھے۔ انہوں نے مولانا سے بے انتہا عقیدت و محبت کا اظہار کیا اور پھر مختلف علمی موضوعات، خصوصاً اس زمانہ میں دعوت اسلامی کا کام کرنے کے متعلق سوالات کرتے رہے۔

**مفتی اکبر شیخ محمد بن ابراہیم سے ملاقات** مغرب کے بعد ہم استاذ عبدالحکیم عابدین کے ساتھ مفتی اکبر شیخ محمد بن ابراہیم سے ملاقات کے لیے ان کے مکان پر پہنچے۔ یہ بھی پیدائشی نابینا ہیں اور اس وقت آل الشیخ کے سب سے بڑے اور بارسوخ بزرگ ہیں۔ کسی خاص موضوع پر گفتگو نہیں

ہوئی، عام قسم کی باتیں ہوتی رہیں یا پھر ہمارا سفر اور اس کا پروگرام موضوع گفتگو رہا۔

**شیخ عمر بن حسن اور محکمہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر** اگلے دن (۱۲ نومبر) صبح کے وقت شیخ عمر بن حسن چند دوسرے علماء کے ساتھ مولانا کی ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ یہ آل الشیخ میں سے ہیں اور پوری سعودی حکومت کے محکمہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے صدر ہیں۔ حکومت سعودیہ کی نہایت قابل تعریف خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں ایک باقاعدہ محکمہ اس کام کے لیے مقرر ہے کہ شریعت کے منکرات کی روک تھام کرے اور معروفات کا حکم دے۔ اس محکمہ کی اپنی الگ پولیس اور جیل ہے۔ یہ محکمہ ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے جس کی بدولت مغربیت کا سیلاب اس مملکت میں اس شدت کے ساتھ اب تک نہیں آسکا ہے جس کا مشاہدہ دوسرے مسلم ممالک میں ہو رہا ہے۔ شیخ عمر بن حسن بڑے ہی ہنس مکھ اور فصیح اللسان آدمی ہیں۔ جتنی دیر بیٹھے رہے بڑی شیریں اور مؤثر زبان میں خدا اور رسول کی باتیں کرتے رہے جن سے محسوس ہوا کہ ان کے دل میں اعلائے کلمۃ الحق اور اصلاح خلق کا گہرا جذبہ ہے۔ آخر میں وہ مولانا کو مفتی اکبر کے چھوٹے بھائی شیخ عبداللطیف بن ابراہیم (جو ریاض میں کلیۃ الشریعہ اور دینی تعلیم کے دوسرے تمام ادارات کے نگران اعلیٰ ہیں) سے ملاقات کرانے کے لیے کلیۃ الشریعہ لے گئے۔ اس روز مجھے اور چودھری صاحب کو بازار کا ایک ضروری کام تھا، اس لیے ہم مولانا کے ساتھ کلیۃ الشریعہ نہ جا سکے۔

مولانا نے کلیہ میں شیخ عبداللطیف کے علاوہ دوسرے اساتذہ بھی ملاقات کی، اور ان کے درس بھی سنے۔ مولانا نے واپس آکر بتایا کہ تمام درس فصیح زبان میں تھے اور تمام اساتذہ اچھی تیاری کے بعد لیکچر دے رہے تھے۔ شیخ مناع القطان اور شیخ عبدالرزاق عفیفی کے لیکچر مولانا کو خاص طور پر پسند آئے۔ شیخ عفیفی اس کالج میں فقہ کے استاذ ہیں۔ دراصل مصری ہیں، لیکن اب انہوں نے سعودی شہریت اختیار کر لی ہے۔ شیخ محمد حامد الفقی کے انتقال کے بعد مصر کی جمعیۃ انصار السنۃ المحمدیہ[1] کے صدر یہی مقرر کیے گئے ہیں۔ بہت ہی باعلم اور نہایت حلیم الطبع اور منکسر المزاج آدمی ہیں۔ ہیں تو مصری، لیکن اپنی ڈاڑھی سے لیے معلوم ہوتے ہیں کہ ہندوستان یا پاکستان کے علماء میں سے ہیں۔

[1] یہ مصر میں جمعیت اہل حدیث کے طرز کی جماعت ہے اور اس کا مسلک بھی وہی ہے جو ہمارے ہاں کے اہل حدیث کا ہے

ریاض میں چند سال سے "جامعۃ الملک سعود" کے نام سے ایک یونیورسٹی قائم ہو چکی ہے اور اس وقت اس کے تحت چار کالج: کلیۃ الآداب (آرٹس کالج)، کلیۃ العلوم (سائنس کالج)، کلیۃ التربیہ (ٹریننگ کالج) اور کلیۃ الطب (میڈیکل کالج) ریاض میں قائم ہیں اور ایک کالج کلیۃ الشریعہ کے نام سے مکہ معظمہ میں چل رہا ہے۔ ریاض کا شریعت کالج، یعنی کلیۃ الشریعہ یونیورسٹی کے ماتحت نہیں ہے، بلکہ اپنی جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ دراصل (جہاں تک ہم نے سنا ہے) اس وقت سعودی عرب میں بھی علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ (جو یونیورسٹی اور حکومت کے نظم و نسق پر حاوی ہے) کے درمیان اختلاف رونما ہو چکا ہے اور ایک طرح کی کشمکش کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ یونیورسٹی قائم ہونے سے پہلے ریاض کے علماء اپنے گھروں پر درس کی مجلسیں قائم کرتے تھے اور ان ہی کی سند، سندِ فراغت خیال کی جاتی تھی لیکن جب یونیورسٹی قائم ہوئی اور اس کے تحت کالج اور جا بجا ابتدائی اور ثانوی مدرسے کھولے گئے تو یونیورسٹی والوں نے دینی علوم کی تعلیم بلکہ صحیح معنوں میں عدالتوں کے لیے قاضی اور وکیل پیدا کرنے کے لیے بھی مصر و شام کے طرز پر دینی کالج قائم کرنا چاہا لیکن علماء ایک تو اپنے آپکو یونیورسٹی کے تحت دینا پسند نہ کرتے تھے اور دوسرے انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ جس طریق پر اب تک دینی علوم کی تدریس کا سلسلہ چلتا رہا ہے، اس میں تغیر کیا جائے۔ بالآخر جس بات پر یہ کشمکش ختم ہوئی، یا یوں کہیے کہ فی الحال رُکی ہوئی ہے، وہ یہ کہ یونیورسٹی والوں نے ریاض میں دوسرے کالج تو قائم کیے لیکن اپنا کلیۃ الشریعہ مکہ معظمہ میں کھولا۔ دوسری طرف علماء کی مجالسِ تدریس کو بھی ایک باقاعدہ شکل دینے کے لیے کلیۃ الشریعہ ہی کے نام سے ایک کالج ریاض میں کھول دیا گیا، جس کا سارا نظم و نسق، نصاب اور ہر چیز علماء کی مرضی کے مطابق طے پاتی ہے۔ ریاض اور مکہ معظمہ کے کلیۃ الشریعہ میں فرق یہ ہے کہ ریاض کے کلیۃ الشریعہ کے ہر طالب علم کو ماہانہ تین سو ریال (تقریباً ۴۰۰ روپیہ) اور اس کے تحت جو دینی مدارس ہیں ان کے ہر طالب علم کو ماہانہ ۱۵۰ ریال (تقریباً ۲۰۰ روپیہ) وظیفہ دیا جاتا ہے لیکن فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس کے لیے ملازمت کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ کسی مسجد میں خطابت یا دینی مدرسہ میں تدریس کی جگہ خالی ہو اور قسمت یاوری کرے تو وہ اسے

پُر کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس مکہ معظمہ کے کلیتہ الشریعہ کے طلبہ کو یونیورسٹی کے دوسرے کالجوں کی طرح تعلیم کے دوران کوئی وظیفہ نہیں دیا جاتا، لیکن فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد ان کے لیے ملازمت کی ضمانت ہے۔ جب تک ملازمت نہیں دی جائے گی، ان میں سے ہر ایک کو ۱۲۰۰ ریال (۱۶۰۰ روپیہ) ماہانہ لازماً ملتے رہیں گے۔ اس طرح گویا سعودی مملکت کے اندر بھی دین اور دنیاوی تعلیم کے دو الگ الگ نظام بن رہے ہیں۔ اس وقت تو حالت ملی جلی سی چل رہی ہے، لیکن چند سال کے بعد کیفیت یہ ہو جائے گی کہ حکومت کی عام مشینری کے لیے کارکن یونیورسٹی کے دوسرے کالجوں سے نکلیں گے، عدالتوں کے قاضی اور وکیل مکہ معظمہ کے کلیتہ الشریعہ سے حاصل ہوں گے اور مساجد کے لیے خطیب اور امام ریاض کا کلیتہ الشریعہ مہیا کرے گا یعنی اسی قسم کے جداجدا عناصر پیدا ہو جائیں گے، جس طرح کے دوسرے عرب ممالک میں پائے جاتے ہیں۔

**استاذ حمد الجاسر** کلیتہ الشریعہ سے واپسی پر مولانا نے استاذ حمد الجاسر سے ان کے پریس میں ملاقات کی اور تفصیلی ملاقات کے لیے ان سے اگلے دن کا وقت لیا۔ استاذ حمد الجاسر ریاض کے ادیب بلکہ صحیح معنوں میں شیخ الادباء شمار کیے جاتے ہیں۔ ریاض کے متعلق کوئی گفتگو یا مضمون اس وقت تک مکمل کہا ہی نہیں جا سکتا، جب تک اس میں حمد الجاسر کا ذکر نہ ہو۔ یہ نجد ہی کے رہنے والے اور اس زمانہ میں عرب کے جغرافیہ پر جو چند آدمی سند مانے جاتے ہیں ان میں سے ایک ہیں عرب جغرافیہ کے متعلق ان کے تحقیقاتی مضامین مجمع علمی کے ماہانہ پرچہ میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ چند سال سے انہوں نے ریاض میں مطابع الریاض کے نام سے سب سے پہلا پریس قائم کیا ہے اور اب اس سے ایک ہفتہ وار اخبار "الیمامہ" بھی شائع کر رہے ہیں۔ آج سے چند ماہ پیشتر تک ان کا یہ پرچہ ریاض سے شائع ہونے والا واحد پرچہ تھا، لیکن اب وہاں سے ایک اور ہفتہ وار پرچہ "القصیم" اور ایک ماہنامہ "الجزیرہ" بھی شائع ہونا شروع ہو گیا ہے۔ مولانا ان سے مل کر اپنے سفر کے متعلق معلومات اور بعض اہم تاریخی مقامات کی تحقیق کرنا چاہتے تھے۔ وہ سخت مشغول تھے اور یوں بھی پریس کی کھٹا کھٹ میں کسی تفصیلی گفتگو کا ہونا مشکل تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنے مکان پر

تفصیلی ملاقات کے لیے مولانا کو اگلے دن کا وقت دیا۔

علماء کی سادگی | تین بجے بعد دوپہر ہم شیخ عبدالعزیز بن باز کے ہاں گئے۔ انہوں نے ہمیں کھانے پر بلایا تھا۔ عرب ممالک خصوصاً نجد، حجاز اور شام کے لوگ دوپہر کا کھانا بڑی ہی دیر سے کھاتے ہیں، یعنی تین اور چار بجے کے درمیان، اور پھر سنا ہے کہ رات کا کھانا یا تو کھاتے ہی نہیں یا اگر کھاتے ہیں تو بہت ہلکا کھاتے ہیں، اسی لیے ان کی جو دعوتیں بھی ہوتی ہیں دوپہر ہی کے کھانے پر ہوتی ہیں۔ شیخ عبدالعزیز بن باز کے ہاں اور بھی متعدد اصحاب مدعو تھے، جن میں اکثر ان کے شاگرد اور عقیدت مند ہی تھے۔ کھانا بالکل سادہ اور خالص عربی انداز پر تھا۔ یہاں علماء کی سادگی اور امراء کی شان و شوکت دونوں قابلِ دید ہیں۔ اکثر علماء اب تک بڑی سادہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ خصوصاً شیخ عبدالعزیز بن باز تو نہایت ہی سادہ رہتے ہیں۔ البتہ بعض علماء اب آہستہ آہستہ امیرانہ شان کی طرف پیش قدمی کرنے لگے ہیں۔

عصر کے بعد ہم اپنے ہوٹل واپس آئے اور خیال تھا کہ کچھ دیر آرام کیا جائے، مگر فوراً ہی کلیۃ الشریعہ کے چند طلبہ آ گئے اور مختلف علمی مسائل پر مولانا سے گفتگو کرتے رہے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ عرب قومیت کا زہر نہ صرف ریاض کی یونیورسٹی بلکہ کلیۃ الشریعۃ تک میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔ ان میں سے ایک طالب علم نے مولانا کو عرب قومیت کے خلاف لکھا ہوا اپنا ایک مضمون بھی سنایا اور مولانا سے اس کے سلسلے میں مشورہ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دو صاحب حضرموت کے اور ایک صاحب انڈونیشیا کے بھی آ گئے۔ مغرب کی نماز کے بعد نو کے قریب پاکستانی حضرات تشریف لائے جو ان دنوں تعلیم یا معاش کے سلسلے میں ریاض میں قیام پذیر ہیں۔ ہمارا کمرہ پوری طرح بھر گیا۔ کچھ دیر تو ہم ان کے ساتھ بیٹھے، لیکن مغرب کے بعد ہی چونکہ ہمارا پروگرام شیخ عبداللطیف بن ابراہیم اور امیر عبداللہ بن عبدالرحمٰن کے ہاں جانے کا تھا۔ اس لیے ہم نے ان لوگوں کو شکریہ اور معذرت کے ساتھ رخصت کر دیا۔ پہلے ہم لوگ شیخ عبداللطیف کے ہاں حاضر ہوئے۔ ان سے کلیۃ الشریعہ کے نظامِ تعلیم اور اساتذہ کے متعلق گفتگو رہی۔ کلیۃ الشریعہ کا

نصاب دینے کا انہوں نے وعدہ کیا، مگر بعد میں شاید وہ بھول گئے اور ہمیں بھی یاد دہانی کرانے کا موقع نہ مل سکا، اس لیے ہم یہ نصاب حاصل نہ کر سکے۔

امیر عبداللہ بن عبدالرحمٰن اس کے بعد ہم امیر عبداللہ بن عبدالرحمٰن کے ہاں پہنچے۔ وہ اپنے قصر پر موجود تھے اور انہوں نے بہت تپاک سے ہمارا استقبال کیا۔ پاکستان اور ہندوستان کے مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔ ان کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ نہایت باعلم اور مطلع قسم کے آدمی ہیں اور اخبارات اور کتابوں کا برابر مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان کی ذاتی لائبریری بڑی وسیع ہے اور وہ اس میں برابر اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے مولانا کی چند کتابیں پہلے سے پڑھی ہوئی تھیں، بقیہ کتابوں کے مطالعہ کا انہوں نے شوق ظاہر فرمایا اور ہم نے ان سے عربی کتابوں کا ایک مکمل سیٹ دینے کا وعدہ کیا (جسے اگلی ملاقات پر ہم نے ان کی خدمت میں پیش کر دیا)۔ گفتگو کے دوران درعیہ کا ذکر آیا، تو انہوں نے فرمایا کہ "درعیہ یہاں سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ وہاں میرا اپنا قصر ہے، اس لیے میں آپ لوگوں کو پرسوں وہاں آنے اور شام تک وہیں ٹھہرنے کی دعوت دیتا ہوں، تاکہ آپ لوگ درعیہ کی تباہی کے آثار بھی دیکھ سکیں اور میرے باغ کی سیر بھی کر سکیں"۔ ہم نے بخوشی اس دعوت کو قبول کر لیا۔

عشا کے بعد ہم شیخ عمر بن حسن کے ہاں حاضر ہوئے۔ دوسرے علماء کی نسبت ان کا مکان پختہ اور شاندار ہے اور کسی گلی میں ہونے کے بجائے ایک بڑی سڑک کے کنارے واقع ہے۔ اس وقت ان کے پاس محکمہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سپاہیوں کا ایک دستہ موجود تھا اور غالباً وہ ان کی دن بھر کی کارروائی کا جائزہ لے رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی انہیں رخصت کر دیا۔ گفتگو میں وہ مولانا کے کارناموں — بقول ان کے "جہاد" — کی مناسبت سے صحابہ کرام اور سلف صالحین کے فضائل اور مجاہدین کے اجر عظیم کا ذکر فرماتے اور مولانا کو بار بار دعائیں دیتے رہے۔ پھر ان کی گفتگو کا رخ تقلید کی مذمت اور اس کے رد میں ائمہ اربعہ کے اقوال کی طرف پھر گیا۔ خوشی ہوئی کہ یہ لوگ کم از کم نظری لحاظ سے تو تقلید کے قائل نہیں ہیں، خواہ یہ عملاً حنبلی علماء

ہی کی قدیم کتابیں پڑھتے اور پڑھاتے ہوں اور ان کا دائرۂ علم ان ہی تک محدود ہو۔ دراصل ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ ہم امام احمد بن حنبلؒ کی تقلید نہیں کرتے بلکہ ان کا اتباع کرتے ہیں اور اگر کبھی ان کا یا امام ابن تیمیہؒ و ابن قیمؒ کا کوئی قول حدیث کے خلاف محسوس کرتے ہیں تو اسے ترک کر دیتے ہیں۔ خود امام ابن قیمؒ نے اپنی کتاب اعلام الموقعین میں اور شیخ محمد بن عبدالوہاب نے اپنی بعض کتابوں میں ائمہ کی تقلید سے منع کرتے ہوئے ان کے اتباع کی طرف دعوت دی ہے۔

**استاذ حمد الجاسر کی لائبریری** اگلے دن (۲۲ نومبر) کو علی الصباح استاذ حمد الجاسر ہوٹل پر تشریف لائے اور ہمیں ایک ٹیکسی میں بٹھا کر اپنے گھر لے گئے۔ وہاں دو کمروں میں ان کی ذاتی لائبریری تھی، جو نہایت قیمتی کتابوں پر مشتمل تھی۔ وہاں ان کی عالمانہ شان دیکھنے میں آئی۔ کتابیں دکھانے لگے تو انہیں کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ اپنے زنان خانہ سے چائے لاتے، لیکن اسے درمیان ہی میں رکھ دیا اور کتابوں کے دیکھنے دکھانے میں غرق ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ ٹھنڈی ہو گئی، بلکہ کتاب لگنے سے ایک پیالی ٹوٹ بھی گئی۔ مگر انہوں نے اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ کسی مقام کے متعلق ہم سوال کرتے تو وہ فوراً بتاتے کہ یہ مقام کہاں واقع ہے، اس کا پرانا نام کیا تھا اور اب کس نام سے مشہور ہے۔ اگر کبھی کسی مقام کے متعلق شبہ ہوتا تو متقدمین کا کوئی شعر پڑھتے اور اس سے اس مقام کی تحقیق کر لیتے۔ تین گھنٹے تک ہم ان کے پاس رہے۔ مولانا نے عرب کے مختلف مقامات و آثار کے متعلق ان سے معلومات حاصل کیں۔ کچھ مجھے کاپی پر نوٹ کرا دیں اور کچھ اپنے نقشے پر پنسل سے درج کر لیں۔ فارغ ہونے کے بعد ہم نے ان سے اجازت چاہی تو وہ ہمیں دور تک پیدل چھوڑنے آئے، کیونکہ سڑک جس پر ٹیکسی مل سکتی تھی، ان کے گھر سے فاصلہ پر تھی۔

ظہر کے بعد شیخ عبدالعزیز بن باز کے ایک شاگرد شیخ محمد حسن کے ہاں ہماری کھانے کی دعوت تھی۔ شیخ عبدالعزیز اور ان کے تمام شاگرد و عقیدت مند بھی مدعو تھے۔ شیخ محمد حسن فلسطینی مہاجر ہیں اور نابلس کے قریب کے رہنے والے ہیں۔

**امیر مساعد بن عبدالرحمٰن** اس کے بعد ہم استاذ عبدالحکیم عابدین کے ساتھ امیر مساعد بن عبدالرحمٰن

سے ملنے کے لیے ان کے مکان پر پہنچے۔ امیر مساعد مولانا سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ وہ پہلے سے مولانا کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ۱۹۴۹ء میں حج کے موقع پر یہ مکہ معظمہ میں موجود تھے۔ حج سے پہلے ایک دن انہوں نے مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کو بڑے شوق سے اپنی جائے قیام پر بلایا اور ان سے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے متعلق تفصیلی گفتگو کی۔ مولانا مسعود عالم نے انہیں مولانا مودودی کی وہ تمام کتابیں بھی پیش کی تھیں جو اس وقت تک چھپ چکی تھیں۔ اب کی مرتبہ انہوں نے مولانا کی مزید کتابوں کی فرمائش کی، جن کے مہیا کرنے کا ہم نے وعدہ کیا (اور اگلی ملاقات پر ان کی خدمت میں پیش کر دیا)۔ امیر مساعد نے بتایا کہ جب شاہ سعود پاکستان گئے تھے اس وقت میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ مولانا اس وقت جیل میں تھے۔ شاہ سعود نے مسٹر غلام محمد گورنر جنرل سے مولانا کو رہا کرنے کی سفارش کی، مگر انہوں نے یہ جواب دیا کہ مولانا معافی مانگ لیں تو ہم انہیں رہا کر دیں، مگر چونکہ مولانا نے معافی نہیں مانگی، اس لیے رہائی نہ ہو سکی اس کے بعد امیر مساعد نے مولانا کو ان کی ثابت قدمی پر داد دی اور ان کے لیے خدا کے ہاں اجر کی دعا کی۔ انہوں نے فرمایا کہ معافی مانگ لینے کا مطلب تو یہ ہوتا کہ مولانا اپنے آپ کو مجرم مان لیتے۔ ہمارے سفر کے متعلق گفتگو شروع ہوئی تو امیر مساعد نے ہمیں یقین دلایا کہ سفر میں سہولتوں اور تمام مقامی امراء کو ہدایات کے سلسلے میں جو کچھ ممکن ہے اس میں وہ اور سعودی حکومت کے دوسرے کارکن کوتاہی نہ کریں گے۔ امیر مساعد بالکل نوعمر نظر آتے ہیں۔ داڑھی صاف کرتے ہیں، اس لیے ان کا عمر کا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے ان کے جسم کی ساخت ہی ایسی ہو یا واقعی ان کی عمر کم ہو، کیونکہ ان کے والد عبدالرحمن بن فیصل کا انتقال ۱۹۳۲ء میں ہوا ہے۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد ہم نے اجازت چاہی اور ہوٹل واپس آ گئے۔

عصر کے بعد ہفوف کے مشائخ کے چار صاحبزادے مولانا کی ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ انہوں نے مولانا کی اکثر عربی کتابیں پہلے سے پڑھی ہوئی تھیں اور ان سے خوب

واقف تھے۔ انہوں نے بتایا کہ سفوف کے علماء کو مولانا کی آمد کا سخت انتظار رہا، لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ مولانا سیدھے ریاض پہنچ گئے ہیں تو انہیں سخت افسوس ہوا۔ مولانا سے ان صاحبزادوں کی گفتگو کچھ تو سفوف کے آثار کے متعلق رہی اور کچھ کتاب "پردہ" کی مناسبت سے عرب ممالک میں بے پردگی و بے دینی کی رو کے متعلق۔ الحمد للہ پردہ کے متعلق نجد کے علماء مولانا کی رائے سے متفق ہیں، ورنہ دوسرے عرب ممالک کے علماء نے تو اس بارے میں عملی تو عملی، فکری اعتبار سے بھی ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔

مغرب کے بعد کلیۃ الشریعہ کے طلبہ کا ایک جم غفیر آپہنچا جس میں کچھ طلبہ پاکستان و ہندوستان کے بھی تھے۔ طلبہ اور مشائخ کی آمد نے ہوٹل کے مالک کی بھی آنکھیں کھول دیں۔ شروع میں ایک آدھ دن اس نے ہمیں کوئی اہمیت نہ دی تھی، لیکن اب وہ ہمارا بہت ہی خیال رکھنے لگا۔ اس نے ہمارے کمرے میں بہت سی مزید کرسیوں کا اضافہ کر دیا، لیکن آنے والوں کے لیے وہ بھی ناکافی تھیں۔ بہت سے طلبہ کو چارپائیوں پر بھی بیٹھنا پڑا۔

**شیخ عبداللہ بن خمیس!** عشاء کے بعد شیخ عبداللہ بن خمیس بھی تشریف لاتے۔ یہ ریاض کے ایک بڑے عبدالتی عہدہ دار ہیں لیکن ادب سے انہیں خاصی دلچسپی ہے۔ ادبی موضوعات پر ان کی بعض کتابیں بھی ہیں۔ فقہ اور تاریخ و جغرافیہ پر بھی ان کی اچھی نگاہ ہے۔ درعیہ کے رہنے والے ہیں اور اب بھی اکثر وہاں جاتے رہتے ہیں۔ مولانا سے مختلف فقہی اور تاریخی مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔ پاکستان اور کشمیر کے حالات پر بھی بعض سوالات کیے۔ مولانا کے جوابات کا ان پر اور تمام طلبہ پر اچھا اثر پڑا۔ رات کے بارہ بجے کے بعد یہ حضرات واپس تشریف لے گئے، یہاں تک کہ ہمیں درمیان میں کھانا کھانے کا بھی موقع نہ ملا۔ اس کے بعد کہیں کھانا کھایا۔

---